ڈاکٹر نبیل احمد نبیل
ایسوسی ایٹ پروفیسر، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، ڈویژن آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، لوئر مال کیمپس، لاہور۔
ڈاکٹر شیر علی
چیئرمین اردو ڈیپارٹمنٹ، الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

مجید امجد۔۔۔اُسلوب اور فن کے عیاں اور مخفی پہلوؤں کی بازیافت

Dr. Nabeel Ahmed Nabeel
Associate Professor, University of Education, Division of Arts & Social Sciences, Lower Mall Campus, Lahore.
Dr. Sher Ali
Chairman Urdu Department, Alhamd Islamic University, Islamabad

Majeed Amjad: The Apparent and Potential Aspects of his Style and Art

Majeed Amjad is a seminal figure in Urdu poetry. There is no denying the fact that the distinction of subjects and originality of treatment, wedded with ingenuity of craft is central to Majeed Amjad. He picks seemingly ordinary and every day subjects but through his penetrating vision, blends them with the universal. In this article, Majeed has used metaphor of death in the form of a mound of mud, a common element found in almost every graveyard, everywhere. What makes this dirt something unique and sublime is the treatment given to it by the poet, the fresh perspective embedded in an everyday occurrence. Mud and dirt moist with tears of human suffering, perennial human suffering serve as metaphor of not only our times but in a way the perennial and eternal time that tells the ultimate tale of suffering and servitude that has been the wont of humanity for eons.

Key Words: *Poetry, Modernism, Literature, Majeed Amjad, Style & Art.*

زندگی کی بازیافت کے بارے میں جو مجید امجد کا رویہ تھا اور چیزوں کو ایک انوکھے زاویے سے دیکھنے کا جو اُن کے ہاں سلیقہ تھا۔اِس ضمن میں نظم "کیا قیمت" مجید امجد کی ایک نمایندہ نظم کے طور پر سامنے آتی ہے۔[1] اِس نظم کا موضوع فنا و بقا پر اپنی بنیادیں اُستوار کرتا ہے اور اس موضوع پر مختلف ادوار میں دُنیا، جہان کے ادب میں

شاعروں نے مختلف زاویوں سے ادب تخلیق کیا ہے۔ مٹی کو بنیادی مرکزہ بناتے ہوئے، مجید امجد نے اپنی مذکورہ نظم میں بہت گہرے مفاہیم پیدا کیے ہیں۔ اس نظم کی پہلی لائن ہی بہت زیادہ فکر انگیز ہے۔

''کیا قیمت اُس مٹی کی جو، اب مٹی بھی نہیں ہے''(۲)

یہاں وہ مٹی جو اُن کی مراد ہے، اگر وہ مٹّی، مٹّی نہیں رہ گئی۔ تو وہ کیا ہے؟ اس نظم کا موضوع ہمارے ذہن و فکر اور نظر سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔ اس نظم کا موضوع فنا کا موضوع ہے۔ ہر چیز کو فنا ہے اور مٹّی جو ہے، وہ اُس فنا کی 'ڈپوزٹری' ہے یعنی انسان مر جاتا ہے، مرنے کے بعد اُس کا وجود بالعموم مٹّی ہی کا حصہ ہو جاتا ہے یا مٹّی ہی کو سونپ دیا جاتا ہے، وہ بے شک مسلمانوں کا تدفین کا طریقہ ہو یا ہندوؤں کے ہاں نذرِ آتش کرنے کا طریقہ ہو، لیکن وہ جو انسانی بدن کی نذرِ آتش کے نتیجے میں باقیات ہوتی ہیں، وہ بھی آخرِ کار مٹّی ہی کا حصہ بنتی ہیں، یہاں مٹّی سے مراد وہ محدود مفہوم نہیں ہے، یہاں مٹّی سے مراد کائناتِ ارض ہے اور اس کائناتِ ارض کا جوہر اعظم چوں کہ مٹّی ہے، اس لیے مٹّی ہی اِس نظم کا مرکزہ بنتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی چیز ہے جو مٹّی کے خالص پن کو آلود بھی کرتی ہے اور اُس میں نکھار بھی پیدا کرتی ہے!

ایک سوال سے یہ نظم ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ وہ مٹّی 'جو اب مٹّی بھی نہیں ہے' ۔ اِس کی کیا قیمت ہے؟۔ قیمت کا تعین تو ہم بعد میں کرتے ہیں۔ یہ مٹّی، مٹّی کیوں نہیں ہے اور یہ مٹّی اپنے اُس مٹّی ہونے سے محروم ہوئی ہے یا اس مٹّی میں پہلے سے زیادہ زرخیزی آ گئی ہے؟ یا اس کی ہیئت، اس کی کیفیت اور اس کی خاصیت میں کوئی منفی یا مثبت تبدیلی آئی ہے جس کی وجہ سے مجید امجد نے یہ سوال استقرار کیا ہے کہ 'جو، اب مٹّی بھی نہیں ہے' اگر یہ مٹّی بھی نہیں ہے تو یہ کیا ہے؟

' آنسوؤں کے پانی سے نمک کا مالیدہ ہے
لاکھوں رُتیں گلابوں کی اِس میں کافور ہیں
اِس مٹّی میں سونے والے نام سدا باقی ہیں،
دُنیا والوں کے حرفوں کے حنوط سے
اِس کی اِک اِک ڈھیری پر آنکھیں میچ کے ہاتھ اُٹھاؤ تو
دھیان ایسے ایسے خیالوں کی جانب جاتے ہیں، جن سے دونوں جہاں زندہ ہیں'(۳)

اب یہاں ایک تو 'فنا' کا مسئلہ ہے، وُجودی طور پر جب انسان دُنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اور اُس کا بدن مٹّی کو سونپ دیا جاتا ہے تو اپنے پیچھے وہ رونے والی آنکھیں چھوڑ جاتا ہے۔ اپنے پیچھے تڑپنے والی روحوں کو چھوڑ جاتا ہے، رشتے ناتوں سے بندھے اپنے جیسے دوسرے انسانوں اور رشتوں کو وہ چھوڑ جاتا ہے جو اُس کی جُدائی میں اور اُس کے جانے کے ملال میں اور اُس کے فراق میں مبتلا ہوتے ہیں اور اپنی آہ و زاری سے، اپنے گریے سے اُس ملال کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ یہ مٹّی اُن پسماند گان کے آنسوؤں سے تر ہے اور آنسوؤں میں چوں کہ ایک نمکیلی کیفیت ہوتی ہے۔ مجید امجد کے لفظوں میں 'یہ مٹّی نمک کا مالیدہ' بن گئی ہے 'کُلیتاً نہ سہی، اس مٹّی میں وہ نمک شامل ہے جو رونے والوں کی آنکھوں سے اپنے پیاروں اور بچھڑنے والوں کی یاد میں رواں ہوا ہے۔ اکیلے و تنہا یہیں آکر معاملہ نہیں رُک جاتا بلکہ یہ ' لاکھوں رُتیں گلابوں کی اِس میں کافور ہیں'۔ گلابوں کا اس مٹّی کے ساتھ ایک تلازمہ تو یہ بنتا ہے کہ مٹّی کی ڈھیریوں کے اُوپر گلاب چڑھائے جاتے ہیں۔ مرنے والوں کو یاد کرنے کے لیے اور اُن کی تبریک اور سپاس کے لیے اور اُن کی قبر کو یادوں میں تازہ رکھنے کے لیے گلابوں کے چڑھائے جانے کی ایک روایت ہے، لیکن ' لاکھوں رُتیں گلابوں کی اِس میں کافور ہیں' مٹّی کو انسانی بدن کے سونپے جانے کا عمل جتنا قدیم ہے، اتنا ہی قدیم اُس مٹّی کے اُوپر پسماند گان کے آنسوؤں کی دل فگاری بھی ہے اور پھول چڑھائے جانے کی روایت بھی شاید اتنی ہی پرانی اور قدیم ہے جتنا انسان کا اپنے مردوں کو سپرد ِخاک کرنے کا کلچر پرانا اور قدیم ہے اور وہ پھول بظاہر تو قبروں کے اُوپر چڑھائے جاتے ہیں، لیکن اُن کی کیمیا، اُن کی تاثیر اور اُن کی خوشبو جو ہے، وہ اُس مٹّی کو کافور کرنے کے بھی کام آتی ہے اور یہ عمل نہ جانے کب سے انسانی زندگی میں ہو رہا ہے! سو یہ مٹّی اب نمک کے مالیدے اور اُن پھولوں کی خوشبو سے کافور کا مرکب بن کے یہ مٹّی کیا سے کیا ہو گئی ہے۔ آنسوؤں کی نمکینی کیفیت در حقیقت دوستوں، غم گساروں اور لواحقین کے دُکھ درد کی علامت بھی ہے اور پھر یہ کہ جن آنسوؤں کی جانب شاعر نے اشارہ کیا ہے، وہ لوگوں کے بھی تو آنسو ہو سکتے ہیں جو، اُن کے دُکھ درد کے نتیجے میں آنکھوں سے اُمڈ آئے ہیں، آنسو تو انسانی شکست و ریخت کا بھی سِمبل ہیں، انسان آنسو کب بہاتا ہے، ظاہر ہے کہ جب وہ شکست و ریخت کے نتیجے میں غمگینی کی صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے اور پھر یہ کہ جب وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے تو اُس کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ آتے ہیں، انسان کو درپیش دُکھ درد سماجی بھی ہو سکتے ہیں، وہ دُکھ درد کائناتی بھی ہو سکتے ہیں اور وہ دُکھ درد کسی حادثے کا نتیجہ بھی ہو تو سکتے ہیں، آنسوؤں کی جہت ہمہ گیر ہے، مجید امجد کی نظموں میں سماج اور کائنات کی بلیک پکچر تو اُن کی فکر کے مرکزی دھارے کا ایک جزوِ لاینفک کہا جا سکتا ہے، زمین اپنے بطن میں لوگوں کے دُکھ درد سموتی ہے، دُکھ درد صرف رشتے

داروں، عزیزوں اور ساتھیوں کے بچھڑ جانے کے ہی نہیں ہوتے بلکہ اُن کی شکستہ آرزوؤں کے دُکھ بھی ہیں، اُن کی محرومیوں کے نتیجے میں دُکھ درد جنم لیتے ہیں، اُن کی نارسائیوں کے دُکھ ہیں، اُن کی مظلومیت کے دُکھ ہیں، جنگوں کے نتیجے میں آنے والی تباہی و بربادی کے بھی دُکھ ہیں، انسانوں کی بے گھری کے نتیجے میں بھی دُکھ درد جنم لیتے ہیں، ظالم جب ظلم کرتے ہیں تو مظلوموں کو دُکھ سہنا پڑتے ہیں، ایسے دُکھوں سے انسانی تاریخ بہر طور بے بہرہ نہیں ہے، انسانی دُکھ تو کئی حوالوں سے جنم لیتے ہیں۔انسانی دُکھوں کی متعدد جہات پر بات ہو سکتی ہے۔بقا کے لیے تگ و دو جاری رکھنے کا عمل بھی تو ایک دُکھ ہے۔انسان اپنی بقا کے لیے جو تگ و تاز کرتا ہے، وہ کون سا اس طرح کے عمل کو ہنسی خوشی انجام دیتا ہے یا بروئے کار لاتا ہے! وہ بھی تو کائناتی جبریت ہی کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے، زندگی تو خود ایک جبر اور دُکھ ہے۔انسان بظاہر تو پابجولاں نہیں ہے، لیکن بباطن تو زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، کہیں انسان کو وقت نے جکڑا ہوا ہے، کہیں سماج نے باندھا ہوا ہے، کہیں کلچرل انتھروپولوجی اور روایات نے جکڑا ہوا ہے۔کہیں سیاسی نظام نے جکڑا ہوا ہے اور کہیں سماجی صورتِ حال نے زنجیریں ڈالی ہوئی ہیں، کہیں اقتصادی مجبوریوں نے جکڑا ہوا ہے۔انسان سے اُس کی آزادی چھن جانا کیا ہے؟ مذکورہ صورتِ حال کے نتیجے میں بھی تو دُکھ ہی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔اِس سے کون سی مسرت وانبساط کی صورتِ حال جنم لیتی ہے! اِس سے بھی تو دُکھ ہی دُکھ جنم لیتے ہیں۔دوسرے جو گلابوں کا استعارہ یا علامت کیا ہے؟ وہ انسانوں کے سہانے خواب ہیں، اُن کی جمالیات ہے، سہانے خواب، گلابوں کی صورت یادوں کا حصہ رہیں گے، وہ لوگوں کے ساتھ وابستہ سہانی یادیں ہیں، جو، اب خاک کا پیوند بن گئے ہیں، لیکن وہ اپنے پیاروں کی یادوں میں برقرار ہیں، وہ یادوں کی بھینی بھینی مہک تمام عمر اُن کے لواحقین کے ساتھ رہے گی۔

'اور اس مٹّی میں سونے والے نام سدا باقی ہیں
دُنیا والوں کے حرفوں کے حنوط سے'(۴)

ہمارا اعتقاد بھی ہے کہ 'ہر چیز فنا ہونی ہے۔' سبھی کو فنا ہونا ہے۔یہ فنا ایک ایسی ابدی حقیقت ہے جس سے مفر ممکن ہی نہیں ہے۔'مٹّی میں سونے والوں کے نام سدا باقی کہاں ہیں؟' بظاہر وہ بے نام ہو جاتے ہیں، مٹّی میں مل کر مٹّی ہو جاتے ہیں، لیکن وہ نام کہیں نہ کہیں انسانی یادداشت کا ضمیمہ ضرور بنتے ہیں۔

'دُنیا والوں کے حرفوں کے حنوط سے'(۵)

اب حرفوں کا 'حنوط' ایک نہایت عمدہ اور نہایت گہری علامت ہے، جس کی تفہیم اور تعبیر کی ضرورت ہے۔بالعموم حرف مرنے والوں کے ساتھ مر نہیں جاتے اور حرف کی جو شیلف لائف ہے، وہ صدیوں تک کی ہے

جب کہ وجودی طور پر انسان کی زندگی زیادہ سے زیادہ سو سوا سو سال کی ہو سکتی ہے۔ اب یہ جو 'دُنیا والوں کے حرفوں کا حنوط' ہے، انسانی مشاہدے میں ہے کہ حنوط کاری کا عمل مُردہ اجسام کو محفوظ کر لینے کا عمل ہے جو لفظ ہیں، اُن کی حنوط کاری کیسے ممکن ہے؟' دُنیا والوں کے حرفوں کے حنوط سے' یا خود حرف حنوط زدہ کیسے ہو جاتے ہیں؟ یہ وہ چلتی ہوئی زندگی کا وہ پہلو ہے، جہاں زندگی رُکتی نہیں ہے اور زندگی ہمہ دم تبدیل ہوتی رہتی ہے اور زندگی کے مظاہر بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ حرفوں کو بھی اس عمل سے استثنا نہیں ہے۔ حرف متروک ہوتے ہیں، حرف مر بھی جاتے ہیں اور حرف عجائب گھروں کی زینت بھی بن جاتے ہیں، تو یہ ' حرفوں کا حنوط' بھی ایک نوع کی وہ جو فنا کی روایت ہے ،اُس فنا کی روایت کے ساتھ ہی 'حرفوں کا حنوط ہونا' منسلک ہے کہ حرف بھی مرنے والوں کی یاد میں کہے گئے حرف ،وہ حرف بھی اپنی جگہ ایک حنوطی عمل سے گُزرتے ہیں اور گُزرتے وقت کے ساتھ وہ حنوط ہو جاتے ہیں۔

' اس کی اِک اِک ڈھیری پر آنکھیں میچ کے ہاتھ اُٹھاؤ تو دھیان

ایسے ایسے خیالوں کی جانب جاتے ہیں، جن سے دونوں جہان زندہ ہیں '(۶)

حرف یا تو اذکارِ رفتہ ہونے کی وجہ سے یا امتدادِ زمانہ کی وجہ سے یا کسی بھی اور وجہ سے حرفوں کو بھی فنا ہے اور حرف 'حنوط' بھی ہو گئے، لیکن زندگی چلتی رہتی ہے۔ زندگی تحرک اور تسلسل کا نام ہے۔ ڈھیریاں زمین پر بھی بنتی ہیں اور دلوں پر بھی بنتی ہیں۔ ڈھیریاں مرنے والوں کی یاد سے بھی منسوب کی جاتی ہیں اور گزشتہ ادوار و ایام اور زمانوں کی بھی ڈھیریاں ہوتی ہیں، ماضی کے آثار کی بھی ڈھیریاں ہوتی ہیں، ڈھیریاں اُن تصورات کی شکست و ریخت کی بھی ہوتی ہیں، جن کی جگہ نئے تصورات اور خیالات لے لیتے ہیں۔ جہاں تک حنوط شدہ حرفوں کا معاملہ ہے، اُن کی ڈھیری تو کائنات کے ملبے کا حصہ ہوتی ہے، لیکن بہت ساری ڈھیریاں ایسی ہیں جو ققنس کی طرح اپنی راکھ سے ایک نیا جنم لیتی ہیں۔ مثلاً پرانے فلسفے، پرانے تصورات، پرانی اقدار مرتی ہیں تو پھر ایک نئی قدر، نئے تصور، نئے فلسفے کے رُوپ میں نئے سرے سے جلوہ گر بھی ہو جاتی ہیں، جس میں ماضی کی آمیزش ہوتی ہے، جس میں روایت کا تسلسل ہوتا ہے، سو، بہت سارے انسانی زندگی کے مظاہر اور انسانی زندگی کے بہت سارے ور تارے ایسے ہیں، جو وہ بظاہر اذکار رفتہ اور بظاہر وہ مُردہ ہو گئے ہوتے ہیں، لیکن اپنی مُردنی میں بھی وہ ایک توسیع نو کے ایک عمل کی افزایش کر رہے ہوتے ہیں، یہی وہ عمل ہے، جس کی طرف مجید امجد نے اشارہ کر کے کہا ہے کہ یہ وہ عناصر ہیں جو مرنے کے بعد ایک نیا پیراہن بدل لیتے ہیں، جن کی تشکیلِ نو یا تعبیرِ نو یا تعمیرِ نو سے دونوں جہان زندہ ہیں۔ اگر اقدار، تصورات، فلسفے ہمیشہ کے لیے مر جائیں اور وہ ایک نئے فلسفے اور نئی اقدار کے پیرہن میں ظہور نہ کریں تو پھر یہ زندگی جامد ہو

جائے۔ زندگی ایک تحرک اور تسلسل کا نام ہے اور ہر تسلسل، جہاں اپنی جدّت سے فروغ پاتا ہے، وہاں اپنی قدامت سے بھی اپنے حصے کی کھاد اور نمولیتا ہے تو یہ دونوں جہان کا اُن ڈھیریوں سے زندہ ہونا جو ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ زندگی ایک مسلسل عمل ہے اور زندگی اپنے تسلسل میں قدیم سے بھی اپنے حصے کا رزق کشید کرتی ہے اور جدید سے بھی اپنے حصے کا آب و دانہ لیتی ہے۔

'لیکن ہائے وہ مٹّی جو، اب مٹّی میں مٹّی بھی نہیں ہے
جس پر صدیوں کے گارے کی تہیں ہیں'(۷)

اب نظم میں یہاں ایک طرح کا ناسٹیلجیا اور نوحہ آگیا ہے، یعنی وہ 'مٹّی جو، اب مٹّی میں بھی مٹّی نہیں ہے' ۔ کیسی بلیغ لائن ہے۔ سو، اگر زندگی بدلتی ہے تو مٹّی جو زندگی کا بہت بڑا مظہر بھی ہے اور زندگی کی نگہبان بھی ہے اور زندگی کی ضمانت بھی ہے۔ وہ کیسے غیر مبدّل رہ سکتی ہے؟ مٹّی زرخیزی کی علامت بھی ہے اور نمو کی بھی علامت ہے۔ تمام خوشبوئیں اور سارا مٹّی ہی سے پھُوٹتا ہے۔ یہ کون سی مٹّی ہے؟ 'جو، اب مٹّی بھی نہیں رہی اور جس پر صدیوں کے گارے کی تہیں ہیں'۔ اب یہ صدیوں کا گارا۔ یہ گارا کیا ہے؟ یہ صدیوں کا گارا، وہ مسترد شدہ تصورات، وہ مسترد شدہ انسانی ورثہ تو نہیں ہے؟ جس نے اِس مٹّی کو بوجھل کر رکھا ہے اور جو مٹّی کو کھلی افزایش کے عمل میں اور جس کی کھلی افزایش و نمو ہونے میں ایک رُکاوٹ ڈال رہا ہے تو یہ صدیوں کا گارا۔ وہی ملبہ ہے، اُن تصورات کا، اُن پیش پا اُفتادہ افکار کا، اُن اقدار اور اُن رویوں کا، جنھوں نے مٹّی جو کہ نمو کی علامت ہے، مٹّی جو زندگی کی بہت بڑی ضمانت ہے، اُس مٹّی کے اُوپر وہ گارا پڑا ہوا ہے، یا جما ہوا ہے جو اِس مٹّی کو اپنا پورا جوہر دِکھانے میں رُکاوٹ بھی پیدا کر رہا ہے۔ یہ اُسی طرز کا معاملہ ہے:

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اَڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں (اقبال)(۸)

بسا اوقات ماضی کا ملبہ وہ انسانی خواہشِ نمو اور انسانی صلاحیتِ افزایش کے عمل میں رُکاوٹ بن جاتا ہے، جس کے بارے میں مجید امجد تمثالی انداز میں کہا ہے کہ اس پر 'صدیوں کے گارے کی تہیں ہیں'۔

'دیکھو! تو یہ مٹّی کہاں نہیں ہے
کہاں کہاں یہ ہاتھ اُٹھیں گے
کس کو خبر اِن ٹھیکریوں سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان کے نیچے'

اُن آہن ریزوں سے چُنی ہوئی بنیاد کے نیچے
کس کس سونے والے کے کچے مسکن کی ڈاٹ ہے،
جس میں دِیے ابد کے ٹمٹماتے ہیں‘‘(۹)

اب یہاں نظم میں ’ہاتھ اُٹھنا‘ فی الاصل دُعا کا سمبل ہے۔ فیض احمد فیض نے کہا تھا:

آئیں ہاتھ اُٹھائیں ہم بھی۔۔۔ہم جنھیں سوزِ محبت کے سوا کوئی بُت، کوئی خُدا یاد نہیں (فیض احمد فیض)(۱۰)

’ہاتھ اُٹھانا‘، دعا کا استعارہ ہے۔ دُعا کی علامت ہے۔

بات یہ ہے کہ جو پیوندِ خاک ہو گئے۔ اُن کی لاشوں کو بے حُرمتی سے بچانے کے لیے اور اُس کے اُوپر خاک کا ملبہ ڈالنے کے لیے قبر کا ایک روایتی تعمیراتی انداز وہ یہ ہے کہ قبر کے اُوپر ’ڈاٹ‘ بنائی جاتی ہے۔ یہ ہمارا روز مرہ کا مشاہدہ ہے اور اُس ڈاٹ کے اُوپر مٹّی ڈالی جاتی ہے اور وہ مٹّی ڈھیری بن جاتی ہے۔ وہ ڈاٹ مٹّی کے درمیان اور مرنے والے کے وجود یا نعش کے مابین ایک فصیل کا کام دیتی ہے۔ اب مجید امجد کے سائنسی شعور کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وجود بھلے مٹّی میں مل کر مٹّی ہو جائے، وجود بھلے بے نشاں ہو جائے!، لیکن انسانی زندگی کا جوہر جسے سائنس کی زبان میں ’ڈی این اے‘ کہا جاتا ہے، وہ ناقابلِ فنا ہے، وہ فنا نہیں ہوتا، آج سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ لاکھوں برس پرانی انسانی ہڈیوں کو اور لاکھوں برس قدیم اور پرانی انسانی لاشوں کے جو آثار ہیں، اُن میں بھی انسانی ’ڈی این اے‘ محفوظ رہتا ہے اور انسانی ڈی این اے کی موت نہیں ہوتی اور انسانی ڈی این اے کو ’ری کری ایٹ‘ کیا جا سکتا ہے اور اُس ’ڈی این اے‘ کی مدد سے اُس لاکھوں برس پیش تر مر جانے والے انسان کی شخصیت اور اُس کے اوصاف و اطوار، اُس کے رجحانات، اُس کے جذبات و احساسات اور اُس کی بہت ساری چیزوں کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ اب ’ابد کے دیے‘ کس جانب اشارہ ہے، یہ انسانی ’ڈی این اے‘ کی طرف اشارہ ہے۔ مجید امجد نے جسے ’ابد کے ٹمٹماتے دیے‘ کہا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون سی چیز ٹمٹماتی ہے؟ وہ شے ٹمٹماتی ہے جو نہ پوری طرح روشن ہوتی ہے، نہ پوری طرح بُجھتی ہے، وہ درمیانی کیفیت ہوتی ہے تو یہ زندگی اور موت کے درمیان وہ جو ایک ٹمٹمانے والی کیفیت ہے، وہ اُس ’ڈی این اے‘ کی ہے، جسے شاعری کی زبان میں مجید امجد نے ’ابد کے دیے‘ کہا ہے۔ انسان کو فنا ہے، مٹّی وجود کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے، لیکن انسان کا ’’ڈی این اے‘‘ زندہ رہتا ہے اور اُس ’’ڈی این اے‘‘ سے مزید اور بہت سارے امکانات دریافت کیے جا سکتے ہیں۔ یہاں ’ڈاٹ‘ کو مجید امجد ایک بلیغ مفہوم میں لے کر آئے ہیں۔ وہ جو قبر کی ’ڈاٹ‘ ہوتی ہے۔ وجود ’فانی‘ ہے اور میت کو ٹھکانے لگانے کا کام تدفین کے

ذریعے کیا جاتا ہے اور وجود کی باقیات کو بے حُرمتی اور بے توقیری سے بچانے کے لیے، اُس لاش اور اُس مٹّی جو اُس میّت کی ڈھیری کی علامت بنی ہے، اُن کے درمیان ایک 'ڈاٹ' اُستوار کی جاتی ہے تا کہ مٹّی براہِ راست اُس وجود پر نہ پڑے، ہر چند کہ اُس وجود نے بھی اُس 'ڈاٹ' کے نیچے مرورِ ایام کے ساتھ مٹّی ہی ہو جانا ہوتا ہے۔ سونے والا فنا ہو گیا، اُس کا وجود فنا ہو گیا، لیکن وجود کے فنا ہونے سے، اُس کی روح فنا نہیں ہوتی اور قبر جو علامت اور نشانی فنا کی ہے، اُس میں بھی یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ مکمل فنا کی تشکیل کر سکے اور اب یہ چیز سائنسی طور پر ثابت بھی ہو چکی ہے اور اس سے

"کہاں کہاں یہ ہاتھ اُٹھیں گے؟ چلتے چلتے ذرا ٹھٹھک کر سوچو تو۔۔۔
اِک جھونکے کی لپیٹ میں جن سے یہ دونوں جہاں زندہ ہیں"(۱۱)

یہ جو آخری لائن ہے، یہ آخری مصرع بھی اُس تھیم کے اُوپر مہر لگاتی ہے کہ بظاہر انسان فانی ہے، بظاہر انسانی وجود کو مٹّی میں مل کر مٹّی ہو جانا ہے، بظاہر انسان کے جتنے رویے اور انسان کے زندگی کرنے کے جو طریقے ہیں، وہ اذکار رفتہ بھی ہو جاتے ہیں۔ زندگی اذکار رفتہ نہیں ہوتی، زندگی چلتی رہتی ہے اور زندگی ماضی سے بھی کچھ اپنا حصہ وصول کرتی ہے اور حال اور استقبال کو ساتھ لے کر ایک نئے سفر پر روانہ ہو جاتی ہے، جسے ہم معروف معانی میں مُردہ کہتے ہیں۔ وہ مُردہ ہو کر بھی مُردہ نہیں ہے اور وہ مٹّی جس نے اُس مُردہ جسم کو اپنے اندر جذب کیا، وہ مٹّی زرنگار ہو جاتی ہے، مرنے والی کی اُس ذُریّت سے جس کو فنا نہیں ہے اور جس کو سائنس کی زبان میں "ڈی این اے" کہا جاتا ہے اور جسے شعری پیرائے میں مجید امجد نے " ابد کے ٹمٹماتے ہوئے دیے" کہا ہے، سو، نظم کا مرکزی خیال اور ادعا یہی ہے کہ خود فنا ایک عارضی کیفیت ہے۔ مٹّی اور مٹّی کی ڈھیریاں جو ہیں، وہ اُس فنا کی تمثیلیں ہیں۔ اپنے ظاہری مفہوم میں زندگی "فرد" کی فنا ہوتی ہے، لیکن زندگی کا جوہر نہیں مرتا، اسی لیے زندگی کا سفر رواں دواں رہتا ہے اور انسان کا جو "ڈی این اے" ہے، وہ 'ڈی این اے' ابد تک ٹمٹماتا رہے گا، بے شک وہ وجودی طور پر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ وجودی طور پر وہ معدوم ہو گیا ہے، لیکن انسان چوں کہ زندگی کا بہت بڑا عامل ہے اور انسان زندگی کا بہت بڑا سمبل ہے، چناں چہ اس زندگی کو چلتے رہنا ہے اور فنا اور بقا کے بارے میں ہمارے تصورات معروضی نہیں ہیں، وہ موضوعی ہیں۔ اصل میں جو فنا ہے، وہ بھی ایک ہمارا ذہنی معاملہ ہے اور وہ بھی قائم بالذات نہیں ہے، یعنی خود فنا بھی قائم بالذات نہیں ہے، اگر زندگی قائم بالذات نہیں ہے تو فنا بھی قائم بالذات نہیں ہے۔ زندگی اپنی کُلیت میں کبھی نہیں مرے گی اور زندگی کا 'مورَل' ہی یہ ہے کہ زندگی چلتی رہے گی، اپنے ماضی کو لے کر،

اپنے حال اور مستقبل کو لے کر اور اِس دُنیا کی بڑی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ فرد کے وجود کو فنا ہے۔ تہذیب کو فنا ہے، روایات و اقدار کو فنا ہے، لیکن زندگی ناقابلِ فنا ہے۔

میر تقی میر نے کہا تھا:

مرگ اِک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
دست کش نالہ پیش رو گریہ
آہ چلتی ہے یاں عَلَم لے کر
اس کے اُوپر کہ دل سے تھا نزدیک
غم دُوری چلے ہیں ہم لے کر
تیری وضعِ ستم سے اے بے درد!
ایک عالم گیا اَلم لے کر (۱۲)

غزل کی محدودیت ہوتی ہے کہ غزل کے کسی ایک شعر میں کسی بڑے خیال کی شاعر محض ایک جھلک پیش کر سکتا ہے۔ بڑا خیال پوری توانائی اور سیاق و تناظر کے ساتھ سمونا کارِ آساں نہیں ہوتا جب کہ نظم کا یہ وصفِ خاص ہے کہ مختلف زاویوں سے، اور مختلف سمتوں سے اور مختلف جہتوں سے اُس خیال کو کماحقہ نظم کیا جا سکتا ہے اور بیان بھی کیا جا سکتا ہے۔ میر تقی میر کے شعر کا تھیم بھی وہی ہے کہ زندگی رُکتی نہیں ہے اور جسے ہم فنا سے تعبیر کرتے ہیں، وہ بھی ہماری ایک موضوعی ذہنی کنڈیشنگ ہے، وہ ہماری موضوعی تفہیم اور تعبیر ہے ورنہ فنا و بقا بہ ذاتِ خود ایک دوسرے کو کمپلیمنٹ کرتے ہیں۔ فنا میں بقا ہے اور بقا میں فنا ہے اور زندگی فنا اور بقا دونوں کے تال میل سے چلتی ہے۔ زندگی کو اُس طرح فنا نہیں ہے جس طرح کا فنا کے بارے میں ہمارا روزمرہ کا مشاہدے میں آتا ہے اور وہ تصور موضوعی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد مرتب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا(لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص۷۰۹۔

۲۔ ایضاً، ص۷۰۹۔

۳۔ ایضاً، ص۷۰۹۔

۴۔ ایضاً، ص۷۰۹۔

۵۔ ایضاً، ص۷۰۹۔

۶۔ ایضاً، ص۷۰۹۔

۷۔ ایضاً، ص۷۰۹۔

۸۔ علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، (لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۰۵ء)، ص۲۳۵۔

۹۔ ایضاً، ص۷۰۹۔

۱۰۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، (لاہور: مکتبہ کارواں، ۱۹۹۰ء)، ص۱۶۷۔

۱۱۔ ایضاً، ص۷۰۹۔

۱۲۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر (جلد اول) مرتبین ڈاکٹر احمد محفوظ، ظلِ عباس عباسی، شمس الرحمٰن فاروقی (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان نئی دہلی، ۲۰۱۳ء)، ص۲۶۰۔